کو سیاسی اقتدار اعلیٰ سے اٹھا کر ایک مخصوص مدت کے لیے آئینی اقتدار اعلیٰ کے ایوانوں میں لا کھڑا کرتا ہے تاکہ وہ اپنی خواہشات پر مبنی قانون بنا سکیں اور اس مدت کے دوران عوام ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے البتہ آئینی اقتدار اعلیٰ سے محروم سیاست دان چاہیں تو سیاسی اقتدار اعلیٰ (عوام) کو بے وقوف بنا کر آئینی مقتدرِ اعلیٰ کو مخصوص مدت سے قبل ہی ختم کر سکتے ہیں اور خود آئینی اقتدار اعلیٰ کی حیثیت اختیار کر سکتے لیکن پیشہ ور سیاست بازوں کا ایک اور غول سیاسی مقتدرِ اعلیٰ کو ایک بار پھر بے وقوف بنا کر نئے مقتدر اعلیٰ گروہ کا خاتمہ کر سکتا۔ عوام کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا تصور یہی ہے کہ وہ بار بار بے وقوف بنتے رہیں تاکہ ان کی حماقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں بے وقوف بنانے کا سلسلہ جاری رکھا جا سکے۔

جمہوریت میں عوامی رائے عامہ کی جس طرح دھجیاں اڑائی جاتی ہیں اور حزب اختلاف اور حزب اقتدار اپنی اپنی خواہشات کی تکمیل جس طرح عوامی جذبات سے کھیل کھیل کر کرتے ہیں اسے کچھ وقت کے لیے نظر انداز کرتے ہوئے مشورے کی غرض و غایت اور اس کے طریق کار کو سامنے رکھا جائے تو بھی جمہوریت پر ایمان لانے والوں کا مشورے اور رائے کے نام پر جمہوریت کو مشرف باسلام کرنے کا طریقہ غلط ٹھہرتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مشورہ کسی اہم کام کا فیصلہ کرنے سے پہلے کیا جاتا ہے اور یہ صرف ان افراد سے لیا جاتا ہے جو اس کام کے ماہر ہوں نہ کہ ہر فرد سے ہاتھ کھڑے کرا کر مشورہ لیا جاتا ہے اور ہر مشورہ لینے والا اٹھنے والے ہاتھوں کو گن کر فیصلہ نہیں کرتا کہ کس موقف کی حمایت میں زیادہ ہاتھ اٹھے ہیں۔

"خیر القرون قرونی" میں مشورے کا طریق کار

مشورے کی غرض و غایت اور اس کے معنوی طریق کار سے ہی کچھ وقت کے صرف نظر سے کام لیتے ہوئے ایک نظر دیکھیے کہ کیا اسلام بھی عوام سے رائے اور مشورہ لینے کے اسی طریق کار کو اپنانے کا درس دیتا ہے جو جمہوریت نے عطا کیا ہے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جمہوریت پسند مسلمانوں نے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے قرآن پاک کی جن دو آیات کا سہارا لے رکھا ہے ان سے مشورہ اور رائے لینا تو

ان کی سمجھ میں آتا ہے لیکن مشورے کا طریق کار کیا ہونا چاہیے، اس سے جان چھڑانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ ورنہ مسلمان ہونے کے باوجود جمہوریت ان کی بھی مجبوری نہ بنتی۔

سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۳۸ "امرھم شوریٰ بینھم" میں مسلمانوں (انصار) کے ایک عمل کا ذکر ہے اور مسلمانوں کے اس عمل کی تفصیل، یعنی یہ کس طرح انجام پاتا ہے، اس آیت میں مذکور نہیں بلکہ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ میں اللہ تعالیٰ نے مشورے کا طریق کار کیا ہونا چاہیے، کا ذکر ایک حکم کی صورت میں کیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے "(جنگ احد کے معاملے میں بھی) ان کے قصور معاف کر دو۔ اور (خدا سے بھی) ان کے گناہوں کی بخشش چاہو اور معاملات (صلح و جنگ) میں (بدستور سابق) ان کو شریک مشورہ کر لیا کرو پھر (مشورہ کے بعد) تمھارے دل میں ایک بات ٹھن جائے تو بے تامل اس کو کر گزرو (مگر) بھروسہ خدا پر ہی رکھنا۔ جو لوگ خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں، خدا ان کو دوست رکھتا ہے۔"

قرآن پاک میں مذکور مسلمانوں کے ایک تعامل اور اس کے طریق کار کو پیش نظر رکھتے ہوئے خود ہی فیصلہ کر لیجیے کہ اس سے "کثرتِ رائے ہی درست" کا نظریہ بھلا کیسے ثابت ہو سکتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ آج جمہوریت کو مشرف با اسلام کرنے والے جس آیت کا سب سے زیادہ حوالہ دیتے ہیں وہی مشورے کے درست طریق کار کے بارے میں رہنمائی کرتی ہے وہی بتا رہی ہے کہ مشورے کا مقصد یہ نہیں کہ کثرتِ رائے کو قبول کر لیا جائے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (دورِ حاضر میں امام یا امیر) اس کی وضاحت انشاء اللہ آئندہ ہوگی) جس رائے کو پسند کریں وہی اپنائی جائے۔ مشورے کے اس درست طریق کار کی مزید وضاحت "خیر قرون قرنی" میں مشورے کے عملی طریق کار سے ہوتی ہے۔ قاضی جصاص "احکام القرآن" میں آیت شاورھم کے تحت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشورے کا طریق کار کچھ اس طرح ذکر کرتے ہیں۔ "آپؐ صحابہ کے ہمراہ مل کر سوچ بچار کیا کرتے تھے اور جس امر کے سلسلے میں آپؐ کو ظن غالب حاصل ہو جاتا اس پر عمل کرتے تھے۔" احکام القرآن میں ہی دوسرے مقام پر انھوں نے لکھا ہے کہ "صحابہ کرام اپنی آرا پیش کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ مل کر غور کرتے اور سوچتے اور (اس کے بعد) جس نتیجے پر آپؐ کو آپؐ کا اجتہاد پہنچاتا اس پر عمل کرتے تھے۔"

خلفائے راشدین کے دور میں مشورے کا طریق کار

صحابہ کرام نے "امرھم شوریٰ بینھم" اور "شاورھم فی الامر" کی روشنی میں مشورے کا کون سا طریقِ کار اختیار کر رکھا تھا؟ اس امر کا تذکرہ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے بھی مترادف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے معاملات کس طرح بروئے کار لائے جاتے تھے اور لائے جائیں!

امام بخاری اپنی عظیم تصنیف بخاری میں ــ قول اللہ تعالیٰ وامرھم شوریٰ بینھم وشاورھم فی الامر ــ کے باب میں لکھتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین مباح امور میں امین اہل علم سے مشورہ کرتے تاکہ کوئی آسان سی ترکیب ہاتھ آجائے لیکن جب کتاب و سنت کا حکم واضح ہو جاتا تو پھر اس سے تجاوز نہ کرتے۔" امام بخاری نے ان دو آیات کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ صرف ایک آیت "امرھم شوریٰ بینھم" سے مشورے کا خود کوئی طریق کار طے کرنا غلط ہے اور مشورے کا وہی طریق کار درست ہے جس کا ذکر دوسری آیت شاورھم فی الامر میں ہوا ہے۔ امام بخاری نے صحابہ کے مشورہ کے جس طریقِ کار کا ذکر کیا ہے اس سے یہ اصول بھی سامنے آتا ہے جس طرح حکم خداوندی میں شوریٰ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی (اس امر کی توضیح امام ابن العربی نے "احکام القرآن" میں آیت "شاورھم فی الامر" کے تحت بھی کی ہے) اس طرح اس امر میں بھی مشورے کی حاجت نہیں رہتی جس کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دیا ہو یہ اس لیے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم و ارادہ کی صداقت و حقانیت کی توثیق بھی اسی آیت میں کر دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک عام صحابی سے لے کر جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ رحلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فوراً بعد لشکر روانہ نہ کیا جائے یا پھر سالارِ لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کی بجائے کسی اور کو بنا دیجیے کیونکہ نو مسلم ابھی مسلم قومیت کے نظریہ اور تصورِ مساوات سے پوری طرح آشنا نہیں ہوئے تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان تمام صحابہ کے مشورے کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر مجھے یہ ڈر بھی ہو کہ جنگل کے درندے میری لاش نوچ لیں گے تب بھی لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ روانہ کروں گا اور ان کی کیا مجال ہے کہ وہ اس سالار لشکر کو بدل دیں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سالارِ لشکر بنایا ہو۔ اسی حقیقت

حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے جنگ احد میں پہاڑی پر مقیم پچاس مسلح افراد کے امیر عبداللہ بن جبیرؓ نے اکثریت کی رائے اور مشورے کو مسترد کر دیا تھا۔ امام بخاری نے شورائیت کے سلسلے میں جس اصول کا ذکر کیا ہے صحابہ کرام کی پوری زندگی میں یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے یہ اس لیے کہ مشورہ کسی عزم سے پہلے ہوتا ہے اور جس کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دے دیا ہو اس پر عمل کرنے کے لیے مشورے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہاں تو شورائیت کے اس رہنما اصول کی روشنی میں صحابہ کرام کا مشورے کا طریق کار پڑھیے اور دیکھیے کہ وہ اپنے فکری اختلافات کس طرح حل کیا کرتے تھے، صحابہ کرام میں سب سے پہلا اختلاف اس امر میں ہوا کہ کیا آپؐ واقعی ہم میں نہیں رہے۔ امام بخاری کے مطابق عمر فاروقؓ ہاتھ میں تلوار لیے کہتے تھے "اللہ کی قسم آپ فوت نہیں ہوئے" جو یہ زمانے میری تلوار اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ لیکن جونہی ایک نحیف و نزار بزرگ (صدیق اکبر) سے قرآن پاک کی آل عمران کی آیت نمبر ۱۴۴ "وما محمد الا رسول" اور سورۂ زمر کی آیت نمبر ۳۰ "انک میت وانھم میتون" سنی تو تلوار ہاتھ سے گر گئی اور گردن احکام خداوندی کے سامنے جھک گئی۔ دوسرا اختلاف اس وقت ہوا جب انصار نے "ہمارا امیر ہم سے ہو اور تمہارا تم میں سے ہوگا" کا دعویٰ کیا مگر جب ابوبکر صدیقؓ کی زبان سے "الائمۃ من قریش" ایسی حدیث سنی تو ــــ سب اپنے ارادے سے باز آ گئے اور گردنیں جھکا لیں۔ آپؐ کو دفن کہاں کیا جائے اور قبر کی ہیئت کیا ہو، اس قسم کے فیصلے بھی حدیث نبوی کی روشنی میں طے ہوتے۔ حضرت عمرؓ شام کے سفر کے ارادہ سے نکلے جب مقام سرغ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ شام میں طاعون پھیلا ہوا ہے۔ مزید سفر جاری رکھنے کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا اس موقع پر حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے حدیث پیش کی کہ جہاں وبا پھوٹ پڑی ہو وہاں نہیں جانا چاہیے (مسلم) جسے سن کر عمر فاروقؓ لشکر سمیت واپس لوٹ آئے۔

خلفائے راشدین کا معمول تھا کہ کوئی بھی مشکل پیش آتی تو فوراً پوچھتے کہ اس امر کے بارے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا کوئی فرمان کسی کی نظر میں ہے۔ ابن قیمؒ نے "اعلام الموقعین" میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اسی طرز عمل کو بیان کیا ہے جب کہ "تاریخ الخلفاء" میں بھی یہ لکھا ہے کہ ابوبکر صدیقؓ حدیث رسولؐ سن کر خوشی سے فرماتے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم

کیونکہ ایسے لوگوں کو دیکھ رہے ہیں جن کے سینوں میں ہمارے نبی کی سنت محفوظ ہے۔" خلفائے راشدین حدیثِ رسول کے سامنے آنے کے بعد اپنے فیصلے بدلنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ اسے اپنی نجات کا باعث سمجھتے اور حدیثِ رسول پیش کرنے والے کی قدر کرتے۔ جناب علیؓ کا خلفائے راشدین میں ایک عالم، منصف اور مشیر کی حیثیت سے اپنا امتیازی مقام ہے لیکن ترمذی کے مطابق جب ان کے پاس مرتد لائے گئے اور انھوں نے انہیں جلانے کا حکم دیا مگر عبداللہ بن عباسؓ نے "من بدل دینه فاقتلوه" کی نشاندہی کی تو جناب علیؓ نے فرمایا: "ابن عباسؓ سچ کہتے ہیں۔" حدیث کے بارے میں سب صحابہ کا یہی موقف تھا کہ مخلوقِ خدا میں سے ہر ایک کی سب باتیں قابلِ قبول نہیں ہوتیں، کچھ قابلِ قبول اور کچھ رد کر دینے کے قابل ہوتی ہیں لیکن حضورؐ کی سب باتیں قبول کرنے کے ہی قابل ہوتی ہیں بصورتِ دیگر اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین اور فیصلوں کو دل سے بھی تسلیم نہ کرنے یا بار گراں تصور کرنے والا قرآن کی نظر میں مسلمان بھی نہیں رہتا۔

خلفائے راشدین جہاں کتاب و سنت کے پیش نظر اپنے موقف کو چھوڑ دیتے تھے وہاں ہر اس صحابی کی رائے کو بھی تقویت دیتے اور ترجیح دیتے جس کی رائے کتاب و سنت کے مطابق ہوتی تھی اور اس رائے کے مقابلے میں کسی کی بھی رائے کوئی مقام نہیں رکھتی۔ حضرت عثمانؓ نے جناب علیؓ سے کہا ولید بن عقبہ کو شرعی حد لگائیں کیونکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس نے شراب پی تھی۔ عبداللہ بن جعفرؓ نے کوڑے مارنے شروع کیے۔ حضرت علیؓ شمار کرتے رہے جب چالیس کوڑے لگ چکے تو جناب علیؓ نے فرمایا۔ اب رک جاؤ۔ عہدِ نبویؐ اور خلافتِ صدیق تک شراب کی حد چالیس درے تھی۔ حضرت عمرؓ نے اسی کی حد مقرر کی۔ مجھے عہدِ نبویؐ میں رائج حد پسند ہے۔" (مسلم) حضرت عثمانؓ نے سکوت اختیار کر کے اپنی اس رضامندی کا اظہار کر دیا کہ جناب علیؓ کی رائے درست، سنت کے قریب بلکہ سنت کے مطابق ہے۔ حضرت عمرؓ کا یہ فرمان بھی اس حقیقت کی نشاندہی کر رہا ہے کہ "اگر میں خلیفہ مقرر نہ کروں تو سنتِ نبویہ کا عامل ہوں گا اور اگر خلیفہ مقرر کر دوں تو ابوبکر صدیقؓ کی سنت پر عمل ہو گا۔" (مسلم) حضرت عمرؓ کا عمل زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے سنتِ نبوی کو مقدم رکھا۔

خلفائے راشدین ہر فرد سے مشورہ نہیں کیا کرتے تھے بلکہ "امین اہلِ علم سے مشورہ کرتے۔" (بخاری) بخاری میں ہی حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول مروی ہے کہ عمرؓ کی مجلس مشاورت میں ذی علم لوگ ہوا کرتے تھے خواہ وہ سن رسیدہ ہوں یا جوان۔ خلفائے اربعہ نے مشورے کے سلسلے میں

اکثریت و اقلیت کو معیار بنانے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ مشورہ اس لیے کیا کرتے تھے تاکہ انھیں ہر عمل میں کتاب و سنت کو سامنے رکھنے میں آسانی ہو نہ کہ وہ "مشورہ کے گز" سے صحابہ کرام کی رائے کی پیمائش کرنا چاہتے تھے۔ مزید وضاحت کے لیے امام شافعیؒ کا یہ قول نقل ہے جو فتح الباری باب فی قولہ تعالیٰ وامرھم شوریٰ بینھم سے کیا گیا ہے "حاکم کو مشورے کا حکم صرف اس لیے دیا جاتا ہے کہ مشیر اس کو ان امور سے آگاہ کردے جس کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا اور اس کی دلیل سے اس کو مطلع کرے یہ حکم اس لیے نہیں دیا جاتا کہ حاکم مشیر کے مشورہ یا بات کی تقلید کرے کیونکہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے سوا کسی کی بھی پیروی کرنا فرض نہیں"۔ اسی طرح امام ابن تیمیہؒ "السیاسۃ الشرعیہ" میں لکھتے ہیں کہ "اگر شوریٰ کے کسی فرد نے کتاب و سنت اور اجماع کے مسئلہ کی کوئی واضح دلیل پیش کردی تو اس وقت خواہ کتنی بڑی جمعیت ایک طرف ہو جائے اور اس سے کتنے ہی بڑے بھونچال کا خطرہ بھی ہو تو اسے خاطر میں نہ لایا جائے اگر دلائل کے لحاظ سے بھی اختلاف پیدا ہو جائے تو مسلم حکومت کو اس کی رائے پر فیصلہ کرنا چاہیے جو کتاب و سنت سے زیادہ قریب اور مشابہ ہو"۔

مشورہ کے طریق کار کے بارے میں تصریحات طویل ہوتی جارہی ہیں لیکن طوالت اختیار کرنے کا جذبہ اس ذہنیت کا ردِ عمل ہے "جو آج مسلمانوں کے قلب و ذہن میں سرایت کرگئی ہے جس کے نتیجے میں وہ کثرت رائے ہی درست اور ہر فرد سے مشورہ لینے کے عمل کو درست ثابت کرنے کے لیے اسلام کا نام لینا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان سے اس سلسلے میں اب مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ آخر قرآن پاک کی یہ آیات ان کی نظر سے کیوں نہیں گزرتیں جن میں اس حقیقت کا ذکر ہے کہ اکثریت کا شمار ناسمجھ (الدخان: ۳۹) ناشکرے (البقرہ: ۲۴۳) بے علم (یوسف: ۶۸) آیاتِ الٰہی سے غافل (یونس: ۹۲) قیامت کے منکروں (الروم: ۸) فاسقوں (مائدہ: ۴۹) اور مشرکوں (یوسف: ۱۰۶) میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اس آیت پر بھی غور نہیں کیا جس میں اللہ تعالیٰ نے النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی ہے کہ "اگر آپ ان لوگوں کے کہنے پر چلے جو دنیا میں زیادہ ہیں تو وہ آپ کو خدا کی راہ سے بہکا دیں گے" (الانعام ۱۱۶) "اکثریت درست" کے بعد آخر انبیاء کی بعثت کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے۔ یاد رہے مشورے کی غرض و غایت اور اس کے طریق کار کے بارے میں میں نے مولانا ابوالقاسم بنارسی اور مولانا عبدالغفار حسن اور مولانا عزیز زبیدی کی نگارشات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔